

پیارے صفت

بشری سیال

”پتا نہیں کیوں، مجھے یہ خوش فہمی ہو رہی تھی کہ تم میرے جانے سے اُداس ہو۔“ وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ شام نے اپنے پر پوری طرح وادی پر پھیلا دیئے تھے۔

”اگر تم کہو، تو میں نہیں جانتا۔“ ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ محمد امیر کو جتنی نظروں سے عائنہ گل کے اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”جب جانا ہی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے آج جائیں یا کل اور ویسے بھی آپ کی

چند ٹائینے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر اچانک عائنہ گل رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس لمحے اس پر ادراک ہوا تھا کہ محمد امیر اس کے دل اور زندگی میں کیا اہمیت وحیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اسے اس طرح کھڑے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہوگا جب ٹیرس کا دروازہ کھلا تھا۔

”آپ؟“ وہ محمد امیر کو سامنے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ناولٹ

پانچویں قسط

فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ جائیں، لیٹ ہو رہے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بٹاشت سے کہا تو محمد امیر کو مایوسی ہوئی۔

”اگر تم کہو، تو میں واقعی رُک جاؤں گا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو محمد امیر۔“ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ کہ اسے روک لے، وہ ابھی جانتی نہ تھی کہ وہ شخص کیا تھا۔ مگر ایسے اپنے جذبات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ہنس دی تھی۔

”دو دن بعد میرا پیپر ہے اور آپ بھی تو کہہ رہے تھے کہ کوئی ضروری کام ہے۔“ محمد امیر چند ٹائینے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا تمہارا دل بھی یہی کہہ رہا ہے؟“ وہ بولا۔



ایپ پر میسج کیا تھا۔ اور اب موبائل فون آنکھوں کے سامنے کئے میسج کے Read ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اس کا انتظار لا حاصل تھا۔

”علیزے!“ اس نے اپنے بے حد قریب ماما کی آواز سنی تھی۔

”میری جان۔“ وہ اسے اس طرح سڑک کنارے، اجڑے بکھرے چلے میں تنہا بیٹھے دیکھ کر مرنے لگی تھیں۔

”ماما! وہ میری کال رسیو نہیں کرتا۔ اس نے میرا میسج بھی read نہیں کیا۔ میری خواہش کوئی اتنی بڑی تو نہیں ہے۔ صرف بات ہی تو کنا چاہتی ہوں۔ کیا چلا جائے گا اس کا اگر وہ ایک بار مجھ سے بات کرے۔“ وہ ایک ٹرانس میں نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ ماما اسے دیکھے گئیں۔

”آج تک میں نے زندگی سے کچھ نہیں مانگا۔ کوئی خواہش، کوئی مطالبہ نہیں کیا، پہلی بار کچھ مانگا ہے ماما، میری خواہش کیا اتنی مشکل اور ناممکن ہے ماما کہ وہ مجھ سے ایک بار بات بھی نہیں کر سکتا۔ اسے مجھ سے ایک بار بات کرنی ہوگی ورنہ میں مرجاؤں گی۔ مرجاؤں گی میں ماما! پلیز.....“

”علیزے!“ ماما نے اسے شانوں سے پکڑ کر زور سے ہلایا۔

”ہوش میں آؤ۔“ وہ چلائیں۔

”ماما مجھے محمد امیر سے بات کرنی ہے۔ پلیز!

پلیز۔ do something۔ ماما آپ اس

سے بات کریں، اسے بتائیں کہ آپ کی بیٹی مر

رہی ہے۔“ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

ماما نے اسے سینے سے لگالیا تھا۔ وہ زور، زور سے رونے لگی تھی۔ ماما کو پہلی مرتبہ محمد امیر پر غصہ

آیا تھا اس کی وجہ سے ان کی بیٹی اتنی مایوسی کے

اندھروں میں بھٹکنے لگی تھی۔ زندگی سے بیزار اور

”کیا مطلب؟“ عائشہ گل ٹپٹا گئی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ جانے کے لئے مڑا۔

عائشہ گل کا جی چاہا اسے روک لے۔

”عائشہ گل!“ وہ جاتے جاتے مڑا۔

”محبت کو اگر وقت پر قبول نہ کیا جائے نہ، تو

یہ آپ کو بہت رولا تی ہے۔ در بدر بھڑکاتی ہے

اور میری دعا ہے عائشہ گل!، محبت تمہیں کبھی نہ

رولائے۔“ وہ چلا گیا تھا۔

عائشہ گل گنگ کھڑی تھی۔ وہ اس کے

روئے پر حیران اور کچھ پریشان تھی۔ نکاح کو

ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ اور وہ ابھی سے اس

سے لمبی چوڑی امیدیں لگا رہا تھا۔ مگر جو بھی تھا۔

اس کا روٹھنا عائشہ گل کو پریشان کر گیا تھا۔ ہر بار

کی طرح۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر علیزے

گرد و پیش سے مکمل بے گانہ بیٹھی تھی۔ یکا یک وہ

خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے سیل فون پر کال آنے

لگی تھی۔ اس نے دیکھا، ماما اسے کال کر رہی

تھیں اس نے دومنٹ سوچا اور پھر کال رسیو کی۔

”ماما!“ اس نے چہرے کو رگڑ کر صاف کیا۔

مگر آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔

”آپ مجھے محمد امیر سے محبت کرنے سے

نہیں روک سکتیں۔“ وہ با آواز بلند زور سے چیخی

تھی۔ ماما کی کئی کالز آئی تھیں اور اس نے ایک

بھی کال رسیو نہیں کی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے

حواس کھونے لگی تھی۔

”مجھے محمد امیر سے بات کرنی ہے۔ اس سے

ملنا ہے۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ اس نے محمد امیر

کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر کال نہیں جا رہی تھی۔

”پلیز! محمد امیر ایک دفعہ میری کال رسیو

کر لیں۔“ اس نے روتے ہوئے اسے دلس

ہر چیز سے اچاٹ رہنے لگی تھی۔ ایسی تو کبھی نہ تھی ان کی عزیز سے، بلاشبہ وہ شروع سے ہی ایک سنجیدہ مزاج کی مالک تھی، مگر اس طرح زندگی سے بھاگنے والی تو نہ تھی۔ محمد امیر نے ان کی کل کائنات داؤ پر لگا دی تھی۔



راحیل اور اس کے پیئرٹس کے جانے کے بعد ازائیل اولیس کے روم میں آئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

”یہ اس وقت کیسے سو گیا؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”کافی بھی نہیں پی۔“ اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے کافی کے مگ پر گئی تھی۔

”کافی ٹھنڈی ہو گئی۔“ وہ مگ اٹھا کر باہر کی جانب بڑھی۔

”اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نہ۔“ وہ ایک مرتبہ پھر مڑی۔ اس کے قریب آئی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ نیند میں بھی اس کا چہرہ کچھ روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔

ازائیل باہر نکل گئی۔ اولیس نے دروازہ بند ہونے کی آواز پر آنکھیں کھولیں اور بند دروازے کو گھورا۔

”نہیں کھاؤں پیوں گا کچھ، اور نہ یہ میڈیسن“ وہ ازائیل سے سخت ناراض ہو چکا تھا۔ اسے وہ خود سے دور جاتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہی تو تھی اس اس کی دوست، نمکسار و ہمدرد، اس کی اپنی۔ اس بھری دنیا میں اس کے علاوہ تو اس کا اپنا اور کوئی نہ تھا۔ وہ بھی اس سے دور جانے لگی تھی۔

ایسے میں اولیس بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ ”ازائیل واقعی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی؟“ وہ خود کلامی انداز میں ہولے سے

بڑبڑایا۔ اس کے جانے کے خیال سے ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس کی پریشانی میں یکنخت اضافہ ہو گیا۔ اپنا وجود ایک مرتبہ پھر اس کے لئے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

”میں کون ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ مگر جواب دینے سے اس کا دل اور دماغ قاصر تھے۔ بہت سوچنے اور دماغ پر زور دینے سے بھی کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔

”یہاں آنے سے پہلے میں کہاں تھا؟“ اور اس سوال کے آگے بہت بڑے بڑے سوالیہ نشان گھوم رہے تھے۔ جن کے آس پاس اس کا دماغ بری طرح چکراتا پھر رہا تھا مگر، مایوسی اور بیگانے پن کے ان اندھیروں میں اس کا کوئی جگنو نہ تھا، اور اگر تھا تو اس سے ہاتھ چھڑا کر دور جا رہا تھا۔



محمد امیر کے جانے سے پوری وادی پر آداسی کی دبیز تہہ چھا گئی تھی۔ ہر منظر آداس، ویران اور بے رونق لگنے لگا تھا۔ ہوا ہولے ہولے عائشہ گل کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی نا جانے اسے کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ بے دلی سے بیڈ پر بیٹھی تو سائیڈ ٹیبل پر موبائل فون پر نظر آیا۔ اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ اسمارٹ فون تھا۔ مگر اسے یاد تھا کہ یہ فون محمد امیر کا تو نہیں ہے۔

اس نے سیل فون کو آن کیا تو وال پیپر پر اس کی اور محمد امیر کی وہ تصویر لگی تھی۔ جو رات اس نے عائشہ گل کو انگلی پھنانے کے بعد اس کے ساتھ بنائی تھی۔ کچھ حیران ہوتے ہوئے اس نے فون کو مزید چیک کیا۔

وائس! ایپ پر کچھ وائس نوٹ موجود تھے۔ اس نے آن کیا۔

صرف نکاح کا رشتہ جڑا تھا۔ دل کا تو کوئی تعلق استوار نہ ہوا تھا۔ مگر اسے وہ یاد آ رہا تھا۔ موبائل فون وہیں رکھ کر وہ نیچے آگئی تھی۔ امی بچن میں تھیں۔ وہ ان کے پاس آگئی۔ اور خاموشی سے وہاں کھڑی ہوگئی۔

”چائے بنا رہی ہوں، پیو گی؟“ انہوں نے ایک نظر عائشہ گل کے ملول واداس چہرے کو بغور دیکھا۔

”جی!“ اس نے مختصر جواب دیا اور پلٹ کر بچن سے نکل گئی اور لاؤنج میں آگئی اور آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔ رات ہونے والی بارش کی وجہ سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عائشہ گل کی طبیعت پر ایک عجیب سی سستی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی، اور محمد امیر کے متعلق سوچتے ہوئے چائے کا انتظار کرنے لگی۔



محمد امیر گھر پہنچا تو ڈیڈی موجود نہ تھے۔ ڈرائیور اسے ایئر پورٹ سے پک کرنے آیا تھا۔ بابا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ فریش ہو کر آیا تو ڈیڈی آفس سے آچکے تھے۔ ”اسلام علیکم ڈیڈی!“ محمد امیر نے خوشدلی سے سلام کیا تھا۔ جبکہ دردانہ نے شوہر کے از حد سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

”محمد امیر نے آپ کو سلام کیا ہے۔“ جب انہوں نے جواب نہ دیا تو دردانہ کہے بناء نہ رہ سکیں۔

”سن لیا ہے میں نے۔“ وہ گہری سنجیدگی لہجے میں سموتے ہوئے بولے۔ انداز کاٹ دار تھا۔

”آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے ڈیڈی؟“ وہ صوفے پر جا بیٹھے تھے۔ محمد امیر ان کے

”میری طرف سے ہمارے نکاح کا تحفہ یہ فون، تمہارے لیے۔ تو سر پر ازگفت کیسا لگا؟“ محمد امیر کی بے حد دلکش، زندگی سے بھرپور اپنائیت لئے ہوئے خوبصورت آواز اس کی سماعتوں کو معطر کر رہی تھی۔

”اور دیکھو وال پیپر پر ہماری منگنی کی جو تصویر ہے نہ، اس کو مت ہٹانا عائشہ گل!“ اس کی اس انوکھی خواہش اور فرمائش پر وہ ہولے سے مسکرا دی تھی۔

”اور اب تم مسکرا رہی ہو نہ!“ اگلا واٹس نوٹ سننے کے بعد اس کی ہنسی اچانک تھم گئی تھی۔ ”اتنے کم وقت میں، کتنا جان گئے ہیں مجھے۔“ اس نے اگلا نوٹ اوپن کیا۔

”اور گیلری میں، میں نے اپنی کچھ تصاویر ڈالی ہیں۔ تمہارے لیے۔ میری یاد آئے تو دیکھ لیتا۔“ وہ اس کی شرارت پر ایک مرتبہ پھر ہنس دی تھی۔ اور گیلری اوپن کر کے اس کی تصاویر دیکھنے لگی تھی۔

عائشہ گل نے اتنا مکمل مرد کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی مخمور شہد رنگ آنکھیں، کچھ کہتی محسوس ہوتی تھیں۔ خوبصورت ستواں ناک، ایک غرور اور شان سے اس کے چہرے پر کھڑی تھی، کشادہ پیشانی، سلیقے سے جھے ہوئے بال، سرخ و سفید رنگت، بھرے بھرے لب اور لبوں کے کنارے پر مسکراہٹ۔

”بس کرو، نظر لگاؤ گی کیا۔“ عائشہ گل نے گھبرا کر اس پاس دیکھا اور پھر خود ہی ہنس دی۔ ”میرا جی چاہتا ہے کہ تم مجھے دیکھتی رہو۔ مجھ سے لگا ہیں نہ ہٹاؤ۔“ اس نے محمد امیر کی تصویر پر محبت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ از حد حیران تھی۔ محمد امیر سے ابھی

”ہوں..... بہتر ہیں۔“ اس نے مختصر

جواب دیا۔

”یار سوشل میڈیا پر تمہاری ایک پکچر وائرل ہے۔ جس میں تمہارے ساتھ ایک لڑکی ہے جس نے عبا یا پہن رکھا ہے۔“

”واٹ!“ روما کی بات سن کر وہ کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا تھا۔

”تم سے کس نے کہا؟“ اس نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ جو متاسف نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کہنے کی نہیں، دیکھنے کی چیز ہے۔“ روما نے موبائل فون میں سے اس کی اور عائشہ گل کی تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ محمد امیر کا حال تو ایسا تھا کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دوسری طرف روما منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی کہ وہ اس تصویر کی تردید کرے یا پھر اس کی حقیقت اسے بتائے۔ کیونکہ وہ مزید صبر اور انتظار نہ کر سکتی تھی۔

◆◆◆

ٹھنڈی، بے حس اور خود غرض سی شام نیویارک سٹی میں اتری اور وہاں کے لوگوں کی بے حس اور نفسا نفسی کو دیکھ کر جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئی، اور رات کو وہاں کا پتا دے گئی۔ ایزابیل بہت عرصے بعد راحیل کے ساتھ ڈنر پر آئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ہاف بلاؤز والی بہت خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ راحیل کا ہاتھ تھامے وہ ہوٹل میں داخل ہوئی تو لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”تم بہت حسین لگ رہی ہو۔“ ایزابیل اس کے سامنے بیٹھی تو راحیل نے اس کا ہاتھ تھام کر لگاؤ سے کہا۔

سامنے آکھڑا ہوا۔

”تمہیں فرق پڑتا ہے؟“ انہوں نے طنز کا نشتر چھوڑتے ہوئے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ڈیڈی۔“ وہ مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اتنے دنوں بعد بیٹا گھر آیا ہے، اب جانے بھی دیں نہ۔“ دردانہ نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی، مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ حسین نے غصے سے بیوی کو گھورا۔

”تمہیں لگتا ہے یہ اتنا آسان.....“

”ہیلو اپوری ماڈی.....“ روما بولتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور حسین کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ محمد امیر نے ماں کی طرف دیکھا۔ گویا ایک نیا امتحان شروع۔

”ہائے امیر! کیسے ہو؟ کیسے خیال آیا واپس آنے کا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ اور ذرا یہ بتاؤ نہ کہ میری کال کیوں پک نہیں کر رہے تم۔“ اس کے شانے پر مکا مارتے ہوئے روما نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ محمد امیر کا اس وقت اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ آل ریڈی ڈیڈی کی وجہ سے آپ سیٹ تھا۔

”بیٹھو نہ روما، محمد امیر بھی بس ابھی آیا ہے۔ آرام سے سب باتیں کر لیتا۔“ دردانہ اٹھتے ہوئے بولیں تو حسین نے بغور محمد امیر کے اکتاتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ جہاں روما کے لئے بیزاریت تھی۔

”میں چائے بھجواتی ہوں۔“ دردانہ لاؤنج سے نکل گئیں۔ روما، محمد امیر کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

”اب کیسی ہیں تمہاری خالہ؟“ روما کے سوال پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا تو راحیل اسے بغور دیکھنے لگا۔

”ازائیل بہتر ہوتا ہے کہ چیزیں پہلے ہی کلیئر کر لی جائیں تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔“ راحیل تسلی چاہتا تھا، اور ازائیل اسے متواتر ٹال رہی تھی۔

”ہم یہاں اوپس کو ڈسکس کرنے تو نہیں آئے راحیل۔“ اس نے یاد دلایا تھا اور پھر راحیل نے بھی فی الحال مزید بات کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

اس رات ازائیل اور راحیل کے بہت عرصے بہت لانگ ڈرائیو اور ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ دونوں نے خوب انجوائے کیا تھا ازائیل جو کہ اوپس کی وجہ سے ہمہ وقت پریشان رہتی تھی کچھ وقت کے لئے تمام پریشانی اور ٹینشن بھول گئی تھی۔ راحیل کو بھی امید کی کرن نظر آنے لگی تھی کہ وہ اوپس سے جان چھڑا لے گا۔



ماما علیزے کو گھر سے آئی تھیں۔ اس کے پودے وجود پر گہری چپ اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ماما نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کھانا بنا رہی تھیں۔ علیزے لاؤنج میں صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ مسلسل محمد امیر کو سوچے جا رہی تھی۔ یکا یک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں آ گئی۔

”ماما!“ اس نے انہیں پکارا، آواز سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔

”ہوں!“ اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

”آپ خفا ہیں مجھ سے؟“ وہ ان کے قریب آئی اور بازو ان کے گلے میں حائل کئے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مختصر جواب۔“

”شکریہ!“ وہ اک ادا سے مسکرائی۔

”کیا کھاؤ گی؟“ مینیو کارڈ کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ اس سے دریافت کر رہا تھا۔

”جو تم کھلاؤ۔“ ازائیل کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ اور اسے خوش دیکھ کر راحیل بہت مطمئن تھا۔ ورنہ جب سے اوپس اس کے گھر آیا تھا، راحیل اور ازائیل کے درمیان ناراضی ہی چل رہی تھی۔

راحیل نے کھانا آرڈر کر دیا تھا۔ ازائیل بہت رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ، اور خوش دیکھ کر راحیل بہت مسرور تھا۔

”تم نے اوپس کا کیا سوچا ہے ازائیل!“ راحیل نے اچانک سوال کیا تھا۔ منہ کی طرف فوک لے جاتا ازائیل کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”یعنی تمہاری شادی ہو جائیگی تو اس کے بعد بھی کیا ہاشم انکل اسے گھر پہ رکھ لیں گے؟“ اس نے وضاحت کی۔

”دیکھو راحیل وہ میری ذمہ داری ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوئی تھی۔

”لیکن یہ ذمہ داری تم کب تک نبھائو گی؟“ وہ الجھا۔

”جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔“ اس نے بغیر لگی کپٹی رکھے کہہ دیا۔

”اور اگر وہ ٹھیک نہ ہوا؟“ راحیل نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو راحیل یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ ازائیل نے اسے دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

”اوپس میری ذمہ داری ہے، اور اسے کیسے نبھانا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔“

کالی سیاہ رات کسی بدنیا چڑیل کی مانند
دھرتی پر بال بکھرائے گھوم رہی تھی۔ گہری اُداس
عائشہ گل کے ٹیرس پر کھڑی کمرے کی کھڑکی سے
عائشہ گل کے ملول و اُداس چہرے کو بغور دیکھ رہی
تھی۔ پوری وادی پر خاموشی کی دبیز چادر تھی
ہوئی تھی۔

”نا جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے
تم میرے جانے سے اُداس ہو۔“ گھمبیر لہجہ
اُس کے آس پاس روشنیاں بکھیرنے لگا۔ عائشہ
گل کا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہونے لگا۔ مگر
اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر خود کو کتاب کی
جانب متوجہ کیا۔ امتحانات سر پر تھے۔

دفعۃً اس کی نگاہ ٹیرس کی جانب اٹھی۔
”محمد امیر!“ اس کے لبوں نے بے آواز
جنش کی۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اٹھی اور ٹیرس پر
آئی۔

”محمد امیر!“ اس نے ایک مرتبہ پھر اسے
لُکارا تھا۔ کیونکہ اس نے اسے ٹیرس پر کھڑے
دیکھا تھا۔ مگر وہ تو کہیں پر بھی نہ تھا۔ عائشہ گل
شاکڈ رہ گئی۔ کیونکہ اس نے خود اسے دیکھا تھا۔
وہ آگے بڑھی اور ٹیرس کی ریلنگ کو تھام کر نیچے
دیکھا۔

رات کافسوں پوری وادی پر پھیلا ہوا تھا۔
اندھیرا پہاڑوں کے سینے سے کسی آسیب کی مانند
لپٹا ہوا تھا۔

عائشہ گل پتھر کی کسی مورتی کی مانند کھڑی
نیچے دور تک پھیلی اس دلکش وادی کو دیکھ رہی
تھی۔ اور ساتھ ہی اپنی زندگی پر غور کر رہی تھی۔
اس کے والد اس کی پیدائش کے بعد انتقال کر
گئے تھے۔ اس نے اور امی نے سادہ اور محنت
سے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ یہ پہاڑوں میں
گہری وادی، وادی میں بلند یوں پر بنایا چھوٹا سا

”آئے ایم سوری ماما۔“ اس کی آواز بھرا
گئی۔ ان کا دل بچنے لگا۔

”میں جانتی ہوں، بار بار آپ کو ہرٹ کرتی
ہوں۔ بٹ آئی سویر میں ایسا نہیں چاہتی۔“ اس
کی آنکھیں جھلک پڑیں اور ماما کے ضبط کا پیمانہ
بھی لبریز ہو گیا۔ وہ اسے روتے نہ دیکھ سکتی تھیں۔
”جب سب جانتی ہو تو کیوں خود کو تکلیف
دے کر مجھے پریشانی کرتی ہوں؟“ انہوں نے
اس کا خوبصورت چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر
اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو علیزے شرمندہ
ہونے لگی۔ وہ جانتی تھی، ماما اس سے کتنی محبت
کرتی ہیں۔

”آئے پر امیں..... اس نے ماما کا گال
چوما۔ تو ان کا دل بھی بچنے لگا۔
”میں دوبارہ ہرٹ نہیں کروں گی، نہ خود کو،
نہ آپ کو۔“ اس نے ماما کو یقین دہانی کرواتے
ہوئے کہا۔

”علیزے یہ ستارز آسمان ہو۔ چمکتے
ستاروں کی مانند ہی ہوتے ہیں جنہیں ہم دور
سے دیکھ کر خوش تو ہو سکتے ہیں مگر ان کو چھو نہیں
سکتے۔ بھی بھی۔“ ماما نے ایک مرتبہ پھر اسے
سمجھانا چاہا۔

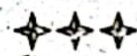
”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما!“ علیزے
نے اثبات میں سر ہلایا۔
”بس مجھ سے غلطی ہو گئی کہ ستارے کو
چھونے کی تمنا کر بیٹھی۔“ اس نے غلطی کا
اعتراف کیا۔

”بس اب مزید یہ غلطی نہ کرنا۔“ ماما نے
اسے پیار سے سمجھایا تو اس نے مسکرا کر سر ہلا
دیا۔ اسے ماما کو ہر حال میں یقین دلانا تھا کہ وہ
بالکل ٹھیک ہے۔

ہٹ نما گھر اس کی کل کائنات تھا۔ اس کے تمام رشتے امی سے جڑے تھے۔ وہی اس کا سب کچھ تھیں۔ اگر ان کے علاوہ کوئی رشتہ تھا تو وہ مراد جیسا جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔

یوں محمد امیر وہ پہلا مرد، وہ پہلا شخص تھا جو اس کی زندگی میں آیا تھا۔ آیا نہیں بلکہ زبردستی گھسا تھا۔ وہ اسے پہلی ملاقات میں اچھا نہ لگا تھا۔ مگر اس سے نکاح اور کچھ دن اس کے ساتھ رہے کہ بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی صاف ستھری اور اچھی طبیعت اور نیچر کا مالک ہے۔

وہ بے خیالی میں ہی اسے سوچے جا رہی تھی اور محمد امیر کو سوچنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ یکا یک وہ پلٹی، اور کمرے میں آگئی۔ محمد امیر کا دیا ہوا موبائل فون اٹھایا اور اپنی اور اس کی وہ تصویر نکال کر دیکھنے لگی جس میں وہ دونوں ساتھ تھے۔ ”اگر میں نکاح سے پہلے منگنی کرتا تو کیا آپ مجھے رنگ پہنانے دیتیں، بزر میں دوڑ بیٹھا آپ کو ماں کے ہاتھ سے انگوٹھی پہنتے دکھایا“ اس کی اس بات کو یاد کر کے اس کے لب مسکرا دیئے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسری تصویر دیکھنے لگی۔



لاؤنج میں اس وقت گھمبیر اور معنی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جبکہ محمد امیر کے لبوں پر جامد چپ کا نفل لگا ہوا تھا۔ جبکہ روما منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ محمد امیر کی معنی خیز خاموشی اسے کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ دس رہی تھی۔

”ایسا خلیہ، اور اتنی فریج فین“۔ روما نے جیسے اپنے ہی کسی خیال سے گہرا کراہتی سوچوں کی خود نگاہ اور تردید کرنے کے لئے امید افزاء نظروں سے محمد امیر کی جانب دیکھا۔

”یہ میری فین نہیں ہے۔“ محمد امیر نے روما

سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ ڈیڈی نے متاسف نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ میری کزن ہے۔“ محمد امیر مزید گویا ہوا۔ روبا چونکی۔

”اچھا!“ روما کا انداز معنی خیز تھا۔ ”وہی خالہ کی بیٹی، جس کے گھر تم گئے تھے؟“ اس نے استفہامیہ نظروں سے محمد امیر کو دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے مختصر جواب دیا۔ ”وہی کزن جس کا تم مذاق اڑا رہے تھے، کہ ہر وقت چہرہ ڈھانپ کر رکھتی ہے؟“ نا جانے کیوں روما دانستہ اسے یہ بات یاد دلا رہی تھی۔ اس کی بات پر محمد امیر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے عائشہ گل کا تذکرہ اس انداز میں بالکل بھی اچھا نہ لگا تھا۔ اسی لئے وہ چپ نہ رہ سکا۔

”She is very nice!“ وہ کہے بناء نہ رہ سکا۔

”واہ!“ روما کو شدید جلن کا احساس ہوا۔ ”کل تک تو وہ تمہیں بیک ورڈ اور نا جانے کیا کیا لگ رہی تھی۔“ روما نے جلتے ہوئے کہا۔ ”میں غلط سمجھا تھا اسے۔“ محمد امیر نے اپنی برا بات کی نفی کی۔

”بلکہ یوں کہہ لو میں اسے سمجھا ہی نہ تھا۔ چائے آچکی تھی۔ اور سرز بھی ہو گئی تھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چائے کی جانب متوجہ نہ تھا۔“ ”اچھا تو کیا اب سمجھ گئے ہو؟“ روما کو نا جانے کیوں کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔

”ہاں!“ محمد امیر نے برملا کہا۔ ”اور اسی لئے.....“

”اسی لئے.....؟“ روما نے بات اس کے

منہ سے اچک لی۔

”میں نے عائشہ گل سے نکاح کر لیا ہے اور اس کے ایگزامز کے بعد ہماری شادی ہے۔“ اس نے گویا بیم بلا سٹ کیا تھا۔ روماشا گدھی۔ اس نے بے یقین سے محمد امیر کو دیکھا۔ جو سکون سے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا چکا تھا۔ رومانے شاکی نظروں سے حسین فراز کو دیکھا۔ جو ابادہ نگاہی پڑانے لگے۔

رات خاصی ہو چکی تھی۔ جب ازابیل ڈنر کے بعد گھر واپس لوٹی تھی۔ اس نے کافی عرصے کے بعد راحیل کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا۔ دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ مستقبل کے سہانے سنے بنے تھے۔ شادی سے متعلق پلاننگز کی تھیں کون سا فنکشن کس طرح یادگار بنانا ہے۔ کیسے ڈریس بنانے ہیں۔ ہر چیز دونوں نے دل سے ڈسکس کی تھی۔

وہ سرورسی اپنے روم کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک اسے اولیس کا خیال آیا۔ اپنے روم کی جانب بڑھتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ پٹی اور دستک دے کر اولیس کے روم میں داخل ہو گئی۔

”اولیس!“ یہ دیکھ کر وہ از حد شرمندہ ہوئی کہ اولیس بھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کا کھانا سائڈ ٹیبل پر بڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اور یقیناً اس نے میڈیسن بھی نہیں کھائی تھی۔ ازابیل کو شدید مجرمانہ احساس نے گھیر لیا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کے قریب آئی۔ وہ خاموشی سے آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا ہوا تھا۔

”اولیس!“ ازابیل نے بازو اس کی آنکھوں سے ہٹایا۔

”آر یو او کے؟“ اس کی آنکھوں میں

گہرے دکھ کے سائے ہلکورے لے رہے تھے۔ ازابیل کو پشیمانیوں نے آن گھیرا۔ اس کا احساس مجرم ایک مرتبہ پھر سر اٹھانے لگا۔ ”تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟“ وہ کسی چھوٹے، معصوم بچے کی مانند خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ ازابیل کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔“ اس نے اولیس کے سرخ و سفید ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجزن درد ازابیل کی بات سے کچھ کم ہوا۔ چہرے پر چھائی مردنی چھٹنے لگی۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے ازابیل کو دیکھا۔

”لیکن تمہاری تو شادی ہونے والی ہے نہ؟“ وہ یقین دہانی چاہتا تھا ازابیل مسکرا دی۔ ”ہاں!“ اس نے سکون سے جواب دیا۔ ”تو پھر تم کیسے مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گی؟“ وہ الجھا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ وہ سکون سے بولی تھی۔ چند تائینے اولیس بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی بات کا تعین نہ کر پار رہا ہو۔ مگر ازابیل کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر وہ یقین کیے بناء نہ رہ سکا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ خوش ہوا۔ ازابیل کو طمانیت کا احساس ہوا۔

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟“ وہ مسکرائی۔

”تم بے فکر رہو۔ میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گی۔ اور دروازے کے باہر کھڑے ہاشم کا جی چاہا وہ اولیس کو اٹھا کر ابھی اسی وقت باہر پھینک دیں۔“ کہاں وہ ان لوگوں کی اتنی پُرسکون اور اچھی زندگی میں کسی مصیبت کی طرح

اُتر اُتھا۔ اس سے جان چھڑانا انہیں بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔

وہ بھاگ کر سڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری سڑھی پھلانگ کر پار کرتا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت سڑھیاں تھیں۔ چمکدار اور روشن۔ ان تک کی زندگی میں اس نے ایسی روشن، چمکدار اور خوبصورت سڑھیاں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ بے حد عجیب و غریب، جسے کوئی جادوئی سڑھیاں تھیں۔ ان پر چڑھتے ہوئے اسے نہ تو کسی ٹھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ نہ ہی وہ کوئی مشکل محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ وہ مسرور و شادماں سا بھاگ کر سڑھیاں چڑھتا اوپر سے اوپر جا رہا تھا۔ ہر نئی سڑھی پچھلی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ عجیب سا منظر تھا۔ انوکھا سا تھا۔ ایک منظر اس کی بصارت کو بھی معطر کر رہا تھا۔ ہر سو بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مشک و عنبر کی خوشبو، عطر و زعفران کی خوشبو۔ وہ بے خودی کے عالم میں اوپر جا رہا تھا۔ ایک سرمستی کی کیفیت تھی جو اسے اپنی لپٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ ارد گرد سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

رات گہری اور سیاہ تھی۔ نیند ملائشیا کی آنکھوں میں اُتری ہوئی تھی۔ ماما کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ دوائے کرسور ہی تھیں۔ علیزے نے ماما کا دل رکھنے کے لیے، اور ان سے کیا گیا وعدہ پورا کرنے کے لئے کھانا کھایا تھا نہ صرف یہ کہ کھانا کھایا تھا، بلکہ بظاہر رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ ماما بھی اسے دیکھ کر کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھیں۔

مگر جیسے ہی ماما سوئیں، اور ملائشیا نے آنکھیں بند کیں تو علیزے کا دکھ پھر سے جاگ

اُٹھا۔ اس کی یکطرفہ محبت کی آگ بھڑک کر اس کے بے چین وجود کو جلانے اور جھلسانے لگی۔ وہ اپنے بیڈ سے بے چینی کے عالم میں اُٹھی اور روم میں موجود کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر رات پورے ماحول پر چھائی ہوئی، ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں۔ تابناک روشنیاں ملائشیاں کی خوبصورتی تو بڑھا رہی تھیں۔ یہ روشنیاں اسے اپنے وجود پر چھائے۔ اندھیرے کا احساس شدت سے دلارہی تھیں۔

”محمد امیر!“ اس کے لب بولنے کے انداز میں پھر پھڑپھڑائے۔ اس نے جلدی سے مڑ کر روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ جیسے اپنی چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔

”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا“ اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے اس کی تصویر نکالی اور شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا زندگی سے بھرپور مسکرانا چہرہ علیزے کے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ وہی حجاب والی لڑکی تھی۔ جس کا ہاتھ اس نے بڑے استحقاق سے تھام رکھا تھا۔

”تم کتنی خوش قسمت ہو“ وہ خیالوں میں ہی اس لڑکی سے مخاطب ہوئی تھی۔ جو محمد امیر کے ساتھ تھی۔

”میں ایک بات تمہیں بتا دوں محمد امیر!“ اس نے تصویر سے نظریں ہٹا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ جسے چاند سے مخاطب ہو کر وہ اس کے ذریعے محمد امیر کو اپنا پیغام بھجوا رہی ہو۔

”تمہیں مجھ سے ملنا ہوگا، مجھ سے بات کرنی ہوگی۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔“ وہ پر یقین انداز میں چشم تصور میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

محمد امیر سکون سے چائے پی رہا تھا۔ اور روما کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حسین فراز کو شدید قسم کے احساسِ جرم نے آن گھیرا تھا۔

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو محمد امیر!“ وہ شاکی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ مگر جواب نہ ارد۔

”جواب دو مجھے۔ اس کا پُر سکون انداز روما کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ غصے سے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

”بی ہیو یور سیلف روما!“ محمد امیر کے ہاتھ میں چائے کا کپ چھلکا اور نتیجتاً کچھ چائے محمد امیر کی شرٹ پر گر گئی تھی۔ وہ چائے کا کپ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”وائس روٹنگ وریو؟“

”تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مجھے دھوکہ دے کر تم سمجھتے ہو کہ بچ جاؤ گے، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ زور سے چلائی۔

”میں نے تمہیں کون سا دھوکہ دیا ہے؟“

محمد امیر کا سکون واطمینان دیدنی تھا۔ روما کے تو کموڈس پر لگی سر پر بھی۔

”تم نے مجھ سے پوچھے بنائے بغیر اپنی اس پینڈو، بیک ورڈ کزن سے نکاح کر لیا۔ کیوں؟“ وہ چیخا۔

”ماہینڈ یور لینگویج روما!“ وہ عائشہ گل کی ایسی تذلیل برداشت نہ کر سکتا تھا۔

”میں اپنے کسی قول اور فعل کے لئے تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔“ محمد امیر نے لمحوں میں اس پر اس کی حیثیت اپنی زندگی

میں واضح کر دی تھی۔ روما شا کڈ تھی۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا جو ہو گیا تھا۔

”تم کتنے بڑے چیٹر ہو!“ وہ چلائی۔

”میں نے کبھی تم سے کوئی کٹ منٹ نہیں کی۔ پھر تم کیسے مجھے چیٹر کہہ سکتی ہو۔“ محمد امیر نے صفائی سے سارا مطلب واپس اسی پر پھینکا تھا۔ وہ اس کے اس رویے پر دنگ رہ گئی تھی۔

✦✦✦

ایزائیل اپنے روم میں آئی۔ ڈریس تبدیل کیا۔ سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ دستک دے کر ہاشم اندر آئے۔ ایک نظر انہیں دیکھنے کے بعد وہ بیڈ کی چادر درست کرنے لگی۔ ہاشم چند ثانیے کھڑے جا بچتی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

”تم سے ضروری بات کرنے آیا ہوں۔“

گہری سنجیدگی لہجے میں سموتے ہوئے وہ گویا ہوئے۔

”کیسے ڈیڈی!“ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ بات اولیس کے متعلق ہے۔ مگر وہ خاموش رہی، پہلے وہ ان کی بات سُنتا چاہتی تھی پھر کچھ کہنا چاہتی تھی۔

”تم نے اولیس کے متعلق کیا سوچا ہے؟ اور اس کا لگان سچ ثابت ہوا۔ انہوں نے وہی سوال کیا جو وہ توقع کر رہی تھی۔ اسے یہی امید تھی بلکہ یقین تھا۔

”کیا مطلب ڈیڈی؟ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ مبادا ان کی بات کا مفہوم نہ جانتی ہو۔

”یہی کہ تمہاری شادی ہو جائے گی تو وہ کدھر جائے گا؟“ انہوں نے کھل کر وضاحت کی اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ اس کی فکر مت کریں ڈیڈی! میں

نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔“

”مجھے اس کی نہیں تمہاری فکر ہے،“ انہوں نے وضاحت کی تو پل بھر کو ازراہیل کچھ نہ کہہ سکی اور پُرسوج نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”میری فکر مت کریں ڈیڈی!“ اگلے ہی لمحے اس نے انہیں صاف الفاظ میں کہا۔

”تم میری اکلوتی اولاد ہو۔“ انہوں نے پل بھر کا توقف کیا۔

”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ محبت پاس لہجے میں بولے۔

”تو پھر اویس کے متعلق غلط سوچنا چھوڑ دیں۔“ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔

”میں نے سوچا ہے اسے کسی ٹرسٹ میں بھجوا دیتے ہیں اور.....“ وہ بولے۔

”ڈیڈی پلیز.....“ اس نے دبا دبا احتجاج کیا اور منت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے ان سے درخواست کی۔ تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔

”ایسا دوبارہ مت کہیے گا۔ میں اسے آپ پر بوجھ نہیں بننے دوں گی۔“ اس نے ان پر واضح کیا تو ان کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔

”مجھے اپنی نہیں، تمہاری فکر ہے۔“ انہوں نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ نا جانے یہ مصیبت کیسے ان کے گلے پڑ گئی تھی وہ سوچ کر رہ گئے۔

”میری فکر مند کریں۔ میں اس کا خیال رکھ کر خوشی محسوس کرتی ہوں۔ میرا احساس جرم کچھ کم ہونے لگتا ہے۔“ اس نے جتایا۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اسے دیکھتے رہے اور بالآخر اٹھ کر چلے گئے۔



روما آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا موڈ بے حد غضبناک تھا۔ اس نے بچپن سے لے کر آج تک محمد امیر کو اپنے

ساتھ، اپنے آس پاس دیکھا تھا۔ وہ اس کا بیٹ فرینڈ تھا۔ اسے وہ بے حد عزیز تھا۔ محمد

امیر بھی اس کے خیال میں اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر اب جو اس نے کیا تھا تو روماشا کڈ تھی۔

اس کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

”روما!“ اس نے ہاتھ میں پکڑا پرس لاؤنج کے صوفے پر زور سے پھینکا۔ پاؤں پختی اپنے

روم کی جانب بڑھ گئی۔ ماما اس کے غضبناک تیور دیکھ کر اس کے پیچھے روم میں آئی تھیں۔

”میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر ہاتھ مار کر سب چیزیں نیچے

گرادیں۔

”روما!“ ماما آگے بڑھیں۔

”کیا بات ہے میری جان؟“

”محمد امیر۔“ وہ غیض و غضب کے عالم میں پلٹی۔ صوفے سے تمام کشتراٹھا کر زمین پر دے مارے۔

”کیا کیا محمد امیر نے؟“

”اپنی خالہ کی بیٹی سے نکاح کر آیا ہے۔“ اس کے انکشاف پر ماما گنگ کھڑی تھیں۔

”میں اسے معاف نہیں کروں گی۔“

”آپ ڈیڈی کو بلائیں۔ ابھی جا کر انکل سے بات کریں۔ وہ..... وہ طلاق دے اس لڑکی کو۔“

”روما! میری جان کنٹرول یور سیلف“ اس نے سردنوں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

”میں بات کروں گی حسن سے۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔

”آپ ابھی ڈیڈی کو بلائیں۔“ وہ ہڈیائی انداز میں مچلائی۔ ماما نے متفکر ہو کر اسے دیکھا۔

”ڈونٹ وری؟“ وہ اپنا سیل فون اٹھا لائیں۔

”میں کرتی ہوں کال تمہارے ڈیڈی کو“۔
وہ کال ملانے لگیں۔ جبکہ رومانتظرنگا ہوں سے
انہیں دیکھنے لگی۔ اسے شدت سے ڈیڈی کا
انتظار تھا۔ اب وہ ہی کچھ کر سکتے تھے۔ اسے محمد
امیر کی غلطی کو سیدھا بھی تو کرنا تھا۔



رات کا آنچل بھگنے لگا تھا۔ ہر سو ہو کا عالم
تھا۔ سارا عالم خواب خرگوش کے مزے لے رہا
تھا۔ وادی کی آنکھیں بھی نیند کے باعث مکمل بند
ہو چکی تھیں۔ دن بھر کے تھکے وادی کے محنت
کش مکس اب گہری نیند کے زیرِ اثر تھا۔ شاید ہی
کوئی جاگ رہا ہو۔

ایسے میں عائشہ گل اپنی کتابیں لیے بیٹھی
تھی۔ یکایک ٹیرس کا دروازہ ہوا کے زور سے بجا
تھا۔ اپنے خیالوں میں مگن عائشہ گل زور سے
کانپی تھی۔ ابھی وہ اٹھ کر دروازہ بند کرنے ہی
والی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا تھا۔ اس نے فون
اٹھایا۔

”محمد امیر!“ اسکرین پر جگمگاتا اس کا
خوبصورت نام دیکھ کر وہ زیر لب بڑبڑائی اور
مسکراتے ہوئے کال رسیور کی۔

”السلام علیکم!“ عائشہ گل نے شائستگی سے
سلام کیا۔ محمد امیر کو ایسا محسوس ہوا احساس اس کی
آواز سے اس کی سماعتیں معطر ہو رہی ہوں۔

”میں انتظار کرتا رہا تم مجھے کال کرو گی۔“
اس نے چھوٹے ہی شکوہ کیا۔ عائشہ گل زیر لب
مسکرا دی۔

”میں نے سوچا آپ تھکے ہوئے ہوں گے
۔ ڈسٹرب نہ ہو جائیں۔“ اس نے بات بنائی محمد
امیر اس کی چالاکی پر ہنس دیا۔

”آپ کی کال پر ہم ڈسٹرب نہیں خوش
ہوئے۔“ وہ چاہت بھرے لہجے میں بولا

تو عائشہ گل کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔
اتنے مختصر وقت میں وہ اس کی زندگی میں جگہ بنا
گیا تھا۔ رشتہ بدلاتھا تو احساسات و جذبات بھی
بدل گئے تھے۔ اور پھر محمد امیر کے جانے کے
بعد جو اداسی وادی کو گھیرے ہوئے تھی اس
نے عائشہ گل کو بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اسے وہ ہر
چیز میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایسے چند دنوں
میں ہی ہر چیز میں اپنا عکس چھوڑ گیا تھا۔ وہ جس
چیز کو دیکھتی، جہاں بیٹھتی اسے محمد امیر ہی دکھائی
دیتا تھا۔

”کیا کر رہے تھے آپ؟“ عائشہ گل نے
اس کی بات کو قصداً نظر انداز کرتے ہوئے بات
کو بدلتے ہوئے استفسار کیا۔ مقصد اس کی بات
کے اثر کو زائل کرنا تھا۔ وہ اس کی چالاکی پر زیر
سب مسکرا دیا۔

”تمہیں یاد!“ عائشہ گل کا جی چاہا سر پیٹ
لے۔ مگر وہ خاموش رہی۔

”اور تم؟“ اس نے بات بڑھاتے ہوئے
استفسار کیا تھا۔ اور عائشہ گل چند ثانیے خاموش
رہی جیسے سوچ رہی ہو کیہ کیا جواب دے۔

”میں پڑھ رہی تھی۔“ اس نے اگلے ہی
لمحے جیسے کچھ یاد آنے پر بتایا۔ اسے اپنے
جذبات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔

”میں سمجھا مجھے یاد کر رہی ہو گی۔“ اسے
مایوسی ہوئی تھی۔ عائشہ گل نے خاموشی میں ہی
عافیت جانی۔

”تم کبھی بھی مجھے خوش نہیں ہونے دیتی
عائشہ گل!“ وہ جتانے لگا۔ وہ ہنوز خاموش تھی۔
”کیا حرج تھا کہ اگر تم کہہ دیتی کہ آپ کو یاد
کر رہی تھی۔“ وہ اسے احساس دلاتے ہوئے،

بولا۔

”آپ چاہتے ہیں میں جھوٹ بولوں؟“ وہ

اسے سمجھانے لگی۔ تو محمد امیر اس کی چالاکی پر ہنس دیا۔

”نہیں..... مختصر جواب آیا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم سچ بولو تا کہ سچائی سن کر میں خوش ہو جاؤں“ وہ اسے جتا گیا۔

”موبائل کے لئے شکریہ!“ اس نے بات ہی بدل ڈالی۔ پھر محمد امیر نے بھی کچھ نہ کہا۔

”شکریہ کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تو شاید نہیں چاہئے تھا مگر میرے لئے بہت ضروری تھا

کہ تمہارے پاس موبائل فون ہوتا۔“ اس کی ہر بات ہی شکوہ لئے ہوئے تھی۔

عائشہ گل ڈسٹرب ہونے لگی۔

”آپ ہر ٹائم مجھ سے خفا کیوں رہتے ہیں؟“ وہ کہے بناء نہ سکی۔

”اور تم ہر ٹائم میری محبت کو انور کیوں کرتی ہو؟“ وہ کب ادھار رکھنے والا تھا۔ دو بد بولا۔

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ انکار کرنے لگی۔ کیسے اسے بتانی کہ وہ تو اس کے جانے کے بعد مسلسل

اس کو سوچتی رہتی ہے۔

”ایسا ہی ہے۔“ وہ فوراً بولا۔

”ایسا نہیں ہے۔ بس میری نیچر Expressive نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ جاتے ہیں۔“ عائشہ گل نے وضاحت ضروری

سمجھی تو کہہ دیا۔

”محبت اظہار مانگتی ہے عائشہ گل!“ وہ اسے جتاتے ہوئے بولا۔ یہ بات وہ اسے بارہا

سمجھا چکا تھا۔ کئی مرتبہ سمجھا چکا تھا۔ مگر عائشہ گل جان کر انجان بن جاتی تھی۔

”جب مجھے آپ سے محبت ہوئی اظہار بھی ضرور کروں گی۔“ وہ اسے بہلانے لگی۔

”آہ! عائشہ گل!“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

”مطلب تم مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“ محمد امیر کی اداس آواز اسے شرمسار کر گئی۔ چند

ثانے خاموش رہنے کے بعد وہ یہ نظم پڑھنے لگا۔

تمہیں عشق ہو خدا کرے

تمہیں کوئی اس سے جدا کرے

تیرے ہونٹ ہنسنا بھول جائیں

تیری آنکھ پر نم رہا کرے

تجھے ہجر کی وہ جھڑی لگے

تو ملن کی ہر پل دعا کرے

تیرے خواب بکھریں یوں ٹوٹ کر

تو کرچی کرچی جٹا کرے

تجھے عشق ہو، پھر یقین ہو

اسے تسبیحوں پر پڑھا کرے

میں کہوں کہ عشق جھوٹ ہے

تو نہیں نہیں کہا کرے

اس نے دل نشین لہجے میں وہ زخمی سی شاعری سنائی۔ ٹیرس پر بے فکری سے اٹھکیلیاں

کرتی ہوا بناء دستک دیئے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور تاسف سے عائشہ گل کو دیکھا۔ وہ

گھبرا سی گئی۔ اور چہرے پر پھرنے والی آواز لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔

”بد عادے رہے ہیں مجھے،“ وہ جیسے اس سے پوچھنے لگی۔ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

”نہیں! احساس دلا رہا ہوں۔“ اس نے فوراً وضاحت کی۔ عائشہ گل گھبرا اٹھی۔

”کوشش کروں گی آئندہ آپ کو شکایت نہ ہو۔“ اس نے کہا۔

”مجھے تم سے اب بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔“ محمد امیر فوراً بولا۔ مگر عائشہ گل کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔

”سفر ٹھیک گزرا تھا؟“ اس نے استفسار کیا اس کی بات پر محمد امیر کو اچانک یاد آیا۔

”ہاں اور میں پرسوں دہی جا رہا ہوں تمہارے لیے کیا لاؤں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
”جو مانگوں دیں گے؟“ وہ کہہ گئی۔
”ہاں!“ وہ یقین سے بولا۔

”آپ کل کو سہ آجائیں۔ ہمارے گھر۔“
اور محمد امیر نے موبائل فون کان سے ہٹا کر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

◆◆◆

حسن فراز آفس سے گھر آئے تو سامنے ایک بہت بڑی ٹینشن ان کی منتظر تھی۔ انہیں محمد امیر کے اچانک ہونے والے نکاح کی خبر رومہ کے شدید ری ایکشن کے ساتھ ملی تھی۔

”ڈیڈ!“ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔
انہیں کال پر راحیلہ نے ساری بات بتائی تو وہ دوڑے چلے آئے۔ اکلوتی بیٹی کی تکلیف اور دکھ ان سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔

”ڈیڈ! محمد امیر نے مجھے چیٹ کیا۔“ وہ رونے لگی تھی۔ آج تک انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کی آنکھ میں آنسو نہ آنے دیئے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر اس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ اسے کسی چیز کے لئے انتظار نہ کرنا پڑا تھا۔ کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔
”بے فکر ہو جاؤ میری جان!“ ڈیڈی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں بات کرتا ہوں بھائی جان سے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔“ وہ خاصے غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ ابھی اس وقت بات کریں انکل سے۔“ وہ کسی طور صبر پر آمادہ نہ تھی۔ اس کا خیال تھا محمد امیر اس کا ہے۔ اس پر صرف اسی کا حق ہے۔

”ریلیکس بیٹا!“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے

بولے تو رومہ نے سران کے کندھے سے اٹھادیا۔
”کیسے ریلیکس ہو سکتی ہوں ڈیڈی!“ وہ لاڈ سے بولی۔ وہ محبت سے اس کا سر سہلانے لگے۔
”ایسا تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا“ وہ ایک مرتبہ پھر روہانسی ہوئی۔ انہوں نے اکلوتی بیٹی کے دکھی چہرے کو دیکھا تو انہیں محمد امیر پر زندگی میں پہلی دفعہ غصہ آیا۔

”سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بیٹی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ ڈونٹ وری۔ ذرا اسے ریلیکس کرنے لگے۔

”اسے اپنے بھتیجے کی طرح جھوٹے خواب مت دکھائیں۔“ ماما نے دونوں انداز میں کہا تو حسن ان کی جانب مڑے۔

”نکاح حسین اور دردانہ کی شمولیت کے ساتھ ہوا ہے۔ یعنی دونوں کی مرضی شامل تھی۔ پھر کیونکر وہ اسے ختم کریں گے۔“ انہوں نے حقیقت پسندی سے کہا۔

”ڈیڈی مجھے محمد امیر نہ ملا تو میں اس لڑکی کو مار دوں گی۔“ رومہ نے سخت پھرے انداز میں کہا۔

”کم آن بیٹا!“ حسن نے کہا۔
”میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا“ وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دے رہے تھے۔

◆◆◆

دوپہر کا وقت تھا۔ آفس میں آج مصروفیت روٹین سے ہٹ کر اور زیادہ تھی۔ علیزے کو سر نے ایک فائل تیار کرنے کو دی تھی۔ جس لے کر وہ اپنی سیٹ پر آئی۔ اور پوری وجہ سے فائل کو دیکھتے لگی۔ اس کے سامنے فائل کھلی ہوئی تھی اور اس کی خوبصورت مخروطی انگلیاں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تیزی سے متحرک تھیں۔ وہ ارد گرد

لگے تھے اور ساتھ ہی عزیزے کا دل بھی۔



نیو یارک انٹرائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ بہت دنوں کی گہری اور سخت دھند کے بعد، شہر کے باسیوں کی امیدیں اور امنگیں بھر آئی تھیں اور سورج آسمان پر آنکھ کھول رہا تھا۔

ایزائیل نے اپنا لمبا سیاہ کوٹ پہنا اور اوپس کو نلے رنگ کا لانگ کوٹ پہنا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ صاف، ستھری سڑک پر وہیل چیئر کو دھکیلے ہوئے، وہ سوچوں میں غلطیاں تھی۔ اس کے چیئر کی پشت کو زور لگانے اور آگے پیچھے ہونے سے دونوں شانوں پر بکھرے۔ اس کے بال ہلکے تھے۔ اس کا رخ گھر سے قریب پارک کی جانب تھا۔ وہ اکثر اوقات اوپس کی یہاں لے آیا کرتی تھی۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ ایزائیل نے استفسار کیا تھا۔ وہیل چیئر کے آواز کو ذرا سا کم کرتے ہوئے وہ نیچے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں گویا ہوا۔ اس لمحے اوپس اسے کسی معصوم بچے کی مانند لگا۔

”ہوں.....!“ اس نے ہنکارا بھرا۔

”اب بہتر ہو رہا ہے؟“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ایک بات بتاؤ۔“ وہ پارک میں داخل ہوا۔ چکے تھے۔ ہمت شکن سردی اور دھند کے پس منظر سورج نے جھلک دکھائی تو پارک میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ وہ ریش پر دھیرے دھیرے وہیل چیئر کو دھکیلنے لگی۔

”پوچھو!“ وہ ہمدردانہ گویا۔

”تم کب تک میرا خیال رکھو گی؟“ وہ پوچھنا دہانی چاہتا تھا۔ ایسی یقین دہانی جس کے بدلہ کوئی وہم اسے ملتا کہ نہ۔

سے بے گانہ اپنے کام میں منہمک میں تھی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ غلطی سے کی بورڈ پر لگ گیا اس کے سامنے کی تصویر نکل آئی تھی۔

”محمد امیر!“

دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے ماما سے کیا وعدہ نبھانے کے لیے دل کو بڑی طرح ڈپٹا۔ محمد امیر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

انگلے ہی لمحے دل نے ایسے بے چین ہو کر اسے پکارا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بے چینی و بے قراری کے عالم میں آفس سے نکلی۔ اس کا رخ گھر کی جانب تھا۔ راستے میں اس کا گزرا اپنے فیورٹ کلب کے سامنے سے ہوا تھا چند ثانیے وہ ادھر رک کر خالی خالی نظروں سے کلب کو دیکھتی رہی۔

”محمد امیر!“ اس کے دل نے بے اختیار ہو کر اسے پکارا۔

”کبھی تو میرے سامنے آؤ گے۔“ وہ خیالوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھی اور حال سے جیسے اس کا رابطہ کٹ چکا تھا۔

کبھی یوں بھی آمیری آنکھ میں

اکہ میری طرف کو خبر نہ ہو

مجھے ایک شام سے نوازدے

مگر اس کے بعد سحر نہ ہو

وہ بزار حیم و کریم ہے

مجھے یہ صفت بھی عطا کرے

تجھے بھولنے کی دعا کروں

تو!

میری دعا میں اثر نہ ہو.....!

سورج تھکنے لگا تھا اور شام شوخ و شگ حسینہ کی مانند جست لگا کر بستر سے اتر رہی تھی۔ ملائیشیا کی دیواروں پر سائے گہرے ہو کر ڈوبنے

”ہمیشہ ایزابیل نے پر یقین لہجے میں کہا۔
”کبھی مجھ سے تنگ تو نہ آؤ گی؟“ وہ مزید
گویا ہوا۔

”ہرگز نہیں“۔ وہ جھٹ سے بولی۔
”تم بہت اچھی ہو ایزابیل“ وہ ہولے سے
مسکرایا تھا۔ اور وہ کبھی کبھار ہی مسکراتا تھا اور
مسکراتا ہوا وہ ایزابیل کو بہت اچھا لگتا تھا۔
”تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو ادیس۔“ وہ
جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے احتیاط
سے بولی۔

”کیا؟“ وہ جھٹ سے بولا۔
”تم کبھی مجھ سے نفرت نہیں کرو گے۔“ وہ
اس کی طرف دیکھتے ہوئے احتیاط سے گویا
ہوئی۔

”میں بھلا ایسا کیوں کروں گا“ وہ حیرت
سے بدن موڑ کر ایزابیل کو دیکھتے ہوئے بولا۔
”نت کا کچھ پتا نہیں ادیس۔ آنے والے
دنوں میں حالات کیسے ہوں“ وہ بولی تو ادیس
نا سمجھی لے عام میں اسے دیکھنے لگا۔

وہ مستعدی سے کام میں مصروف تھیں۔
ایزابیل سے آفس سے آنے میں ابھی دو گھنٹے
رہتے تھے۔ وہ اطمینان سے سنور میں آنے
والے نئے سامان کو سیٹ کر رہی تھیں۔

یہ ایک انہیں زور کا چکر آیا تھا۔ انہوں نے
خود کو بچانے کے لئے سہارے کے طور پر کسی چیز
کو تھامنا چاہا۔

are you ok miss”
merry! ”شو کا مالک ایک ہمدرد انسان
تھا۔ وہ ان کا خیال رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ کافی
حد تک تعاون کرتا تھا۔ وہ بھی ان کی شکر گزار
رہتی تھیں۔

”جی..... جی.....“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ
پائیں۔ مگر درحقیقت انہیں بہت بڑی طرح چکر
آ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے آپ گھر چلی جائیں،
ریسٹ کریں۔ کل طبیعت بہتر ہو تو سنور پر آ
جائے گا۔“ انہوں نے کہا تو وہ تشکر آمیز نگاہوں
سے اس ہمدرد انسان کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”شکریہ!“ اپنا پرس اٹھا کر وہ سنور سے نکل
گئی تھیں۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے اس سنور پر
کام کر رہی تھیں۔ سنور کا مالک ایک انڈین آدمی
تھا جو کہ عمر میں ان سے چھوٹا تھا۔ وہ ان کی بے
حد عزت کرتا تھا۔ وہ کسی حد تک ان کے حالات
سے واقف تھا۔ اسی لیے ان کے ساتھ ہر ممکن حد
تک تعاون بھی کرتا تھا۔

علیزے جب سکول اور پھر کالج جاتی تھی تو
وہی سنور آ جاتی تھی اور پھر ان کے منع کرنے
کے باوجود وہ ہر روز اسے چاکلیٹ دیا کرتے
تھے۔ وہ ان کی ممنون رہتی تھیں۔

گھر پہنچیں تو اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ کھلا
ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئیں۔ علیزے کہیں
دکھائی نہ دی۔ وہ اسے تلاش کرتی ہوئیں اپنے
روم میں آئیں۔

”علیزے!“ وہ مستعدی سے آگے
برہیں اور جھٹنے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے
وہ سیاہ رنگ کی ڈائری لی۔ علیزے ورطہ حیرت
میں ڈوب گئی۔ اسے ماما کا یہ انداز بے حد عجیب
محسوس ہوا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ سورج پورے آب و تاب
کے ساتھ افق پر بلند ہوا تھا۔ اس کی کرنیں وادی
میں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔
پہاڑی وادی میں گھرے جھوٹے سے

بولاً۔ ”مجھے آپ کی محبت پر یقین ہے محمد امیر۔“
اور وہ واقعی اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔ وہ
اس کی چاہت کو ماننے لگی تھی۔ انجانے میں ہی
وہ اس کی محبت کی گرویدہ ہو گئی تھی۔“

اس نے چائے دو کپوں میں ڈالی، محمد امیر کی
ہمراہی میں چلتی لکڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر
آ گئی۔ باہر سردی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔
اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

”بیٹھ جائیں۔“ عائشہ گل خود تین سیڑھیوں
میں سے آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اور چائے کا
سپ لیا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔“ محمد
امیر نے اپنا چائے کا کپ لبوں سے لگایا اور اس
کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عائشہ گل نے گردن اٹھا
کر اس شاندار شخص کو دیکھا۔

”واپسی کب ہے آپ کی؟“ عائشہ گل نے
استفسار کیا۔

”جب تم کہو۔“ وہ جھٹ سے بولا۔
”پرسوں میرا پیپر ہے۔“ اس نے اطلاع
دی۔

”ایک تو تمہاری پڑھائی۔“ محمد امیر نے
نگاہیں اٹھا کر اس سحر انگیز، خوبصورت اور حسین
وادی کو دیکھا اور پھر نظریں پھیر کر عائشہ گل کو
بغور دیکھا۔ اور اس لئے عائشہ گل اسے پوری
وادی اور سارے ماحول پر چھائی ہوئی محسوس
ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔



رات کا نا جانے کون سا پہر تھا۔ نیند حسن
فریاز کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ راحیلہ سو گئی
تھی۔ وہ اٹھ کر بے چینی کے عالم میں کمرے
میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے تھے۔

ہٹ نما گھر کے کچن میں کھڑی عائشہ گل اپنے اور
امی کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ بہت دنوں کے
بعد امی کی طبیعت سنبھلی تھی اور وہ نیچے وادی میں
کچھ گھروں کو ان کے سویٹر اور جریاں واپس
کرنے لگیں تھیں۔

”ایک کپ چائے مجھے بھی مل سکتی ہے؟“
محمد امیر کی شوخ و شنگ، زندگی سے بھرپور آواز
اس کی سماعتوں سے لکرائی۔ عائشہ گل اپنے
الوژون پر زرب لب مسکرا دی۔

”اس وقت آپ آجائیں تو چائے تو کیا
آپ کو جان بھی دے دوں گی اپنی۔“ وہ دھیمے
سروں سے اس سے مخاطب ہوئی۔ تو محمد امیر اندر
تک جیسے سرشار ہو گیا۔ وہ کب اس سے محبت کا
اظہار کرتی تھی۔ اور پھر ایسا اظہار تو محمد امیر کے
وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ نہال ہو گیا۔

”کیا کہا؟“ آواز دوبارہ سنائی دی۔ اب
کی بار عائشہ گل نے کچھ چونکتے ہوئے منہ کر
دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ اسے اپنی بصارت پر
گویا یقین نہ آیا۔ وہ اسے اپنا خواب سمجھی۔

”آپ!“ بے اختیار اس نے دایاں ہاتھ
لبوں پر رکھا تھا۔ آنکھیں پھاڑے وہ حیرت کے
عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی، میں!“ محمد امیر دو قدم آگے آیا۔
”آپ نے یاد کیا، بندہ حاضر ہو گیا“ اس
نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے، ذرا سا آگے کو
جھک کر تابعداری سے کہا۔

”آئی کانٹ بلیوئس“ وہ ابھی تک بے یقین
تھی۔

”کیا آپ واقعی میرے کہنے پر آئے
ہیں؟“

”میری محبت اور خلوص پر شک مت کرو
عائشہ گل۔“ وہ اسے احساس دلاتے ہوئے

بتایا۔ وہاں قطاروں میں مرد، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے اور کچھ بچے بھی بیٹھے تھے۔ ازابیل اسے ساتھ لئے ایک قطار میں جا بیٹھی۔ اویس نا کبھی کے عالم میں آس پاس دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ اور فہم سے یہ سارا ماحول بالاتر تھا۔ ازابیل نے اسے ناجانے کہاں لے آئی تھی، وہ یہی سوچے جا رہا تھا۔



دن کا آغاز بہت خوبصورتی سے ہوا تھا۔ محمد امیر کے آجانے سے پوری وادی روشن ہو گئی تھی۔ دونوں نے چائے پی لی تھی۔ عائشہ گل کپ لے کر کچن میں چلی گئی تھی۔ کب دھو کر رکھے۔

”خالہ جان کدھر ہیں؟“ محمد امیر بھی وہیں آ گیا۔

”وہ کام سے نیچے وادی میں گئی ہیں۔“ اس نے بتایا اور مڑ کر کچن سے باہر آ گئی۔

”یکایک بادل گر جا تھا۔ عائشہ گل نے باہر نکل کر آسمان کی جانب دیکھا۔

”لگتا ہے بارش ہوگی۔“ عائشہ گل نے خود کلامی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

محمد امیر اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا۔

”تمہیں بارش پسند ہے؟“ وہ اس سے پوچھنے لگا۔

”جی۔“ وہ ہونے سے مسکرائی۔

”مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔“ اس نے بتایا۔ اسی لمحے آسمان سے پانی ٹپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری وادی کو نہلانے لگا۔ عائشہ گل نے جلدی سے قدم پیچھے ہٹائے۔ جبکہ محمد امیر بارش میں بھٹکنے لگا۔

”اندر آ جائیں، بیمار پڑ جائیں گے۔“ عائشہ گل نے اسے بلایا۔

ماضی کے درپچوں سے ایک انجان، دلکش، اور روتا چہرہ جھانک کر ان کے دل کو بے چین کرنے لگا تھا۔ ان کی پریشانی حد سے سوا تھی۔ وہ جو اس بے قرار وجود کو بھول چکے تھے، ان بے چین، آنکھوں کو فراموش کر چکے تھے، ان منت سماجت کرتے لبوں کو بھول گئے تھے۔ سب کچھ پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ ایک ایک نقش واضح ہونے لگا تھا۔

”پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔“ وہ برسی آنکھیں یاد آنے پر ان کا دل گھبرانے لگا تھا۔ وہ گھبرا کر روم سے باہر نکل آئے۔

”خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“ ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ جوڑے منت کر رہی تھی۔ وہ لان میں آگئے۔

بلکی خنک ہوا ہر سو چل رہی تھی۔ وہ ٹہلنے لگے تھے۔ انہیں سردی کا بالکل احساس نہ ہو رہا تھا۔



ازابیل اتوار کے روز اویس کو اپنے ساتھ چرچ لے گئی تھی۔ اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے وہ چرچ کی عمارت میں داخل ہوئی تھی۔

اویس حیرت سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

”ازابیل؟“ وہ اس کی چیئر کو دھکیلتے ہوئے ہال میں داخل ہوئی تھی۔ اویس نے سامنے دیکھا۔

”ہوں۔“ وہ آگے بڑھتی رہی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ وہ استفسار کرنے لگا۔

”یہ چرچ ہے۔“ ازابیل نے بتایا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”Prayer کرنے“ ازابیل نے اسے

”اندر آ جاؤ۔ ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ تم بیمار ہو جاؤ گے“ امی نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ اب کی بار محمد امیر انکار نہ کر سکا۔ اور ان کا کہنا مانتے ہوئے اندر آ گیا۔

آندر آتے ہی اس نے چھینک لی۔ عائشہ گل نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ ”تو گویا بارش نے کام کر دکھایا۔“ وہ جلدی سے اپنے روم میں گئی اور ٹاول لا کر اسے دیا۔ ”کب آئے ہو؟“ امی نے دریافت کیا۔ ”بس ابھی۔“ محمد امیر ٹاول سے بال رگڑتے ہوئے بولا۔

”ٹھنڈ لگ رہی ہوگی؟“ امی نے کہا۔ ”جی“ اس نے ایک اور چھینک ماری۔ ”عائشہ جاؤ جلدی سے انڈے اُبال کر دو اسے ساتھ چائے۔“ امی نے اسے ہدایت کی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن کی جانب چل دی۔ جبکہ محمد امیر لباس تبدیل کرنے کے لئے اپنا سامان اٹھا کر گیسٹ روم کی جانب بڑھ گیا۔



علیزے نے کچھ حیران ہو کر ماما کو دیکھا تھا۔ اسے ان کا اندازہ بیت عجیب سا لگا تھا۔ ایسا تو وہ اس کے ساتھ کبھی نہ کرتی تھیں۔ پھر آج کیا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے لب نیم وا کئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ماما؟“ بالآخر اس نے استفسار کیا۔ ماما چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ”بیٹا!“ انہوں نے ڈائری کو اپنے پیچھے چھپایا تھا جیسے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی شے ہو۔ ”اس کو دوبارہ مت اٹھانا۔“ انہوں نے اسے کہا تو علیزے کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ”اس میں ایسا کیا ہے ماما!“ اسے اچنبھا

”تم باہر آ جاؤ۔“ وہ ہتھیلیاں پھیلا کر ان پر بارش کی بوندیں جمع کرنے لگا۔ عائشہ گل اسے دیکھ کر ہنس دی اور پوری وادی اس کے ساتھ مسکراتے لگی۔

اس وقت محمد امیر کو دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ مشہور زمانہ سنگر ہے۔ اسے بارش کی بوندوں کو ہتھیلیوں پر جمع کر کے بچوں کی طرح مسکراتا دیکھ کر عائشہ گل کو بہت اچھا لگا تھا۔ ”عائشہ گل باہر آ جاؤ نہ۔“ وہ اسے بچوں کی طرح ہکا بکا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”آپ بیمار پڑ جائیں گے، سردی بہت زیادہ ہے“ عائشہ گل نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔ مگر وہ کسی ضدی بچے کی طرح مسلسل سر نفی میں ہلاتا رہا۔ عائشہ گل نے اسے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ بوڑھا آسمان بھی اس روز خوب جم کر برسنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وادی خوب سرسبز و شاداب تھی۔ بارش اسے دھو کر مزید نکھار اور سنوار رہی تھی۔ ہر چیز دھل کر نئی ہو رہی تھی۔ ہر شے پر محمد امیر کی طرح مستی چھا رہی تھی۔

اسے بارش میں نہا۔ تہ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ بیرونی دروازہ کھلا اور ہاتھ میں چھتری تھامے امی اندر داخل ہوئیں۔ اپنے سامنے محمد امیر کو دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئیں۔

”ارے!“ وہ تیزی سے اندر آئیں۔ ”محمد امیر آیا ہے۔“ وہ اندر چلی گئیں۔ محمد امیر نے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

”بیٹا!“ امی نے اسے زور سے پکارا۔ کیونکہ بارش کا شور بہت زیادہ تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ہوا۔ ماما نے آج تک کوئی بات یا کوئی چیز اس سے نہ چھپائی تھی۔ پھر اس ڈائری میں ایسا کیا تھا۔ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

”کچھ چیزیں اور باتیں اپنے وقت پر ہی پتا چلیں تو اچھا ہوتا ہے میری جان“۔ انہوں نے معنی خیزی سے کہا۔

”کیا مطلب ماما؟“ علیز بے الجبھی۔

”کچھ نہیں“۔ انہوں نے سر نفی میں ہلایا۔

”میرے سر میں بہت درد ہوا آج پھر۔“

انہوں نے بات بدلی۔

”اسی لئے چھٹی کر کے گھر آگئی....“ انہوں نے مزید بتایا تو علیز بے متفکر ہوئی۔

”آپ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جاب چھوڑ دیں۔ میری سیلری میں ہمارا گزر بہت اچھا ہو جائے گا۔“ وہ کسی حد تک اس کا دھیان بتانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

”فارغ بیٹھوں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی بیٹا۔“ انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مگر اس طرح روز، روز آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔“ علیز بے نے پھر کہا۔

”معمولی سردرد ہے اور کچھ نہیں ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”تم آج جلدی آگئی۔“ وہ جیسے یاد آنے پر کہنے لگیں تو علیز بے گڑبڑا گئی۔

”کام جلدی ختم ہو گیا تھا۔“ وہ بات بنا گئی۔

”میں کھانا بناؤں؟“ ان کا دھیان بنانے کی غرض سے وہ جھٹ سے بولی۔

”نہیں۔“ ماما نے فوراً سر نفی کے انداز میں ہلایا۔

”میں بنا لوں گی۔ تم ریٹ کرو۔“ وہ کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

”میں آپ کی ہیلپ کرواتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ان کے پیچھے چل دی تھی۔

دونوں ہی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ ایک دوسرے سے بات چھپانے اور بات بن جانے پر دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھیں۔

رات مشکل سے گزری تھی۔ حسن فراز کو وہ رات ایک صدی پر محیط محسوس ہوئی تھی۔ انہیں یہ، یہ کر پچیس سال پہلے کی وہ رات یاد آتی رہی تھی۔ وہ روتی، برستی آٹکھیں، وہ مجبور و بے بس چہرہ، وہ مغموم لہجہ۔ جو وہ وقت کی گردش میں اسے یکسر فراموش کر بیٹھے تھے، وقت نے جیسے اسے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے تھے۔

اگلے روز وہ آفس نہیں گئے تھے۔ برائے نام ناشتہ کیا۔ راحیلہ کو ساتھ لیا اور حسین فراز کے گھر بنا اطلاع دیئے پہنچ گئے۔ وہ دونوں میاں بیوی ابھی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہیں سامنے دیکھ کر ان کا ماتھا کچھ ٹھنکا۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔

”محمد امیر دکھائی نہیں دے رہا۔“ حسن فراز نے گویا گفتگو کا آغاز کیا۔

حسین فراز نے دردانہ کی جانب دیکھا۔ ”ادھر ہی ہوگا کہیں“ دردانہ نے جواب دیا۔

”وہ تو جی کو سڑ چلے گئے۔“ ان کی میڈ نے بتایا۔ جو اسی وقت لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

”کب؟“ دردانہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

”صبح۔“ وہ بولی۔

”حیرت ہے، آپ کا بیٹا آپ کو بتائے بغیر

”دیکھیں حسن اور راحیلہ!“ حسین فیراز

بولے۔

”میں اس معاملے میں قطعی قصور وار نہیں

ہوں۔“ انہوں نے صاف اپنا پہلو بچایا۔

”پھر بھی جو سزا آپ دو گے، میں اس کے

لئے تیار ہوں۔“ وہ قطعیت سے بولے۔

”سزا کی بات نہیں۔ بس محمد امیر اس لڑکی کو

طلاق دے کر رومہ سے شادی کرے۔“ حسن

فراز نے مدعا بیان کیا۔ دردانہ آنکھیں پھاڑے

انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”ایسا ہی ہوگا۔“ حسین فراز نے جھٹ

سے کہا۔

”نکاح محمد امیر کی پسند سے ہوا ہے۔ وہ کبھی

بھی طلاق نہیں دے گا۔“ دردانہ خاموش نہ رہ

سکیں۔ وہ کس طرح ان سب کو اپنے اکلوتے

بیٹے کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے سکتی

تھیں۔ اور پھر وہ تھیں بھی محمد امیر کی ماں، بھلا

کیسے چپ رہ سکتی تھیں۔

”تو پھر ہماری بیٹی کے ساتھ جو کمینٹ کی

تھی اس کا کیا؟“ راحیلہ درشتی سے بولیں۔

”سوری راحیلہ، میرے بیٹے نے آج تک

کسی لڑکی سے کوئی کٹ منٹ نہیں کی۔ اور جس

سے کی ہے اس سے نبھائے گا۔“ دردانہ جب

دیکھا کہ سارا الزام ان کے بیٹے پر دھرا جا رہا

ہے وہ خاموش نہ رہ سکیں اور صاف کہہ دیا۔

”محمد امیر نے ساری زندگی ہماری بیٹی کو

آس دلائے رکھی۔ اور آخر میں جا کر چوروں کی

طرح نکاح کر لیا۔“ راحیلہ سخت غصے میں تھیں۔

سیدھے سبھاؤ محمد امیر پر الزام لگانے لگیں۔

”آپ لوگ میرے بیٹے پر الزام لگا رہے

ہیں۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ دردانہ نے ان

کو سنبھال دیا۔ آپ لوگوں کو علم ہی نہیں ہے۔

حسن فراز نے طنز کا نشتر چھوڑا۔ وہ دونوں

میاں بیوی مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے

تھے۔

”اس طرح اچانک وہ کبھی گیا تو نہیں

کہیں بھی۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔“ دردانہ نے

بات بنائی۔

”ہاں اب تو اس کے تمام ضروری کام کو سنبھال

میں ہی ہوں گے۔“ راحیلہ نے ایک مرتبہ پھر طنز

کیا۔

”کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟“ دردانہ نے

بایاں ابرو چڑھائے ٹیکھی نظروں سے راحیلہ کو

دیکھا۔

”وہی جو آپ سمجھنا نہیں چاہتی۔“ راحیلہ کا

موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ اس سے دردانہ نے مزید

کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور خاموشی سے

حسین فراز کو دیکھا۔

”آپ لوگوں نے محمد امیر کا نکاح کر دیا

ہے؟“ حسن فراز نے استفہامیہ نظروں سے

اپنے بھائی کو دیکھا۔

”یہ ان ماں، بیٹے کو پتا ہو۔ مجھے تو خود عین

وقت پر نکاح میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا

تھا۔“ حسین فراز نے بغیر کسی لحاظ کے تمام ذمہ

دردانہ اور محمد امیر پر ڈال دیا۔ دردانہ نے شکوہ

کناں نظروں سے شوہر کو دیکھا، مگر بولی کچھ

نہیں۔

”ہم اپنی بیٹی کے ساتھ ایسی زیادتی

برداشت نہیں کر سکتے۔“ حسن فراز مزید گویا

ہوئے۔

دردانہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ انہیں رومہ سے

جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی وہ بھی اس کے والد کا

روپیہ دیکھ کر غصے میں بدل گئی تھی۔

کتابیں کا بیرونی دامن



ابن انشا کے شعری مجموعے



لاہور اکیڈمی

لاہور اکیڈمی

پبلی نرل محمد علی امین میڈین مارکیٹ 207 سرگرم روڈ اردو بازار لاہور
042-37310797, 042-37321690

”اسٹاپ اٹ دردانہ!“ حسین فراز زور سے دھاڑے۔ دردانہ نے دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو کر حسین کو دیکھا۔ انہیں ان سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ اس انداز سے ان سے بات کریں گے۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔

چرچ میں Prayer ختم ہو چکی تھی۔ اوپس اور ازائیل گھر کو روانہ ہو چکے تھے۔ اوپس عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دل کو ایسی بے چینی، وہ بے کلی لاحق ہو گئی تھی۔ جیسے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ راحیل کی فیملی آئی ہوئی ہے۔ ازائیل اسے ساتھ لیے سب کے پاس آگئی تھی۔ راحیل کے می ڈیڈی نے ناپسندیدہ نظروں سے اوپس کو دیکھا تھا۔

”کدھر سے آرہے ہو تم لوگ؟“ راحیل کی می نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ازائیل سے کاٹ دار لہجے میں استفسار کیا تو وہ چند ثانیے انہیں خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”چرچ گئے تھے Prayer کر کے آئے ہیں۔“ ازائیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بہتر ہوتا کہ تم چرچ راحیل کے ساتھ جاتی۔“ وہ ناپسندیدہ نظروں سے اوپس کو دیکھتے ہوئے بولیں تو ازائیل نے ہاشم کو دیکھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔

”آئی یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر جگہ راحیل کے ساتھ جاؤں۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ اس نمونے کے ساتھ جاؤ۔“ انہوں نے بناء کسی لحاظ کے کہا تو ازائیل نے تیزی سے اوپس کی جانب

سے کئے گئے عہد کو اس نے ہر حال میں نبھانا تھا۔



حسن فراز اور راحیلہ کو حسین فراز نے مکمل یقین دلا کر بھیجا تھا۔ کہ محمد امیر اپنی کزن کو طلاق دے کر رومہ سے شادی کر لے گا۔ وہ دونوں مطمئن ہو کر گھر آئے تھے۔ راحیلہ کو البتہ محمد امیر کے ساتھ ساتھ دُردانہ پر بھی سخت غصہ تھا۔ کہ وہ ان کی بجائے محمد امیر کا ساتھ کیوں دے رہی ہیں۔ اس لئے انہوں نے دُردانہ کو اچھی خاصی سناڈالی تھیں۔ انہیں خوشی اسی بات کی تھی کہ حسین فراز نے ان کا بھیر پور ساتھ دیا تھا اور جو غلطی ان کے بیٹے نے کی تھی وہ اسے سدھارنے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔

”محمد امیر سے بات کی آپ لوگوں نے؟“ رومانے بے صبری سے پوچھا۔

”اس نے کیا کہا؟ وہ کب طلاق دے گا اس لڑکی کو؟“ رومانے صبر نہ ہو رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے دریافت کیا۔ اس کی بات پر حسن اور راحیلہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”محمد امیر سے ہماری بات نہیں ہوئی۔“

حسن نے اسے صاف بتایا ”تو پھر حسین انکل کے کسی وعدے یا یقین دہانی کا کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ ایک دم مایوسی سے بولی۔ اس کا سارا جوش فوراً ختم ہو گیا تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ سب حالات سیٹ ہو کر اس کی فیور میں ہو گئے۔ اسے اگلے ہی لمحے پتا چلا کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ اس نے مایوسی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”میں امیر کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ اتنی آسانی سے اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ تو راحیلہ اور حسن بھی

دیکھا جس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ ”اگر آپ لوگوں نے ایسے ہی مجھ پر اعتراضات کرنے ہیں تو راحیل ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے۔ تم سوچ لو۔“ وہ راحیل کی جانب مڑی، کچھ فکری سے اسے دیکھا اور کہہ کر رکی نہیں۔ اویس کی وہیل چیز کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ سب نے حیرت و بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

وہ ایک فرمانبردار، ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ پھر اب اسے کیا ہو گیا تھا۔ سب بے یقین سے تھے۔ اس لڑکے نے ان کے گھر اور رشتوں کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ ہاشم نے پُر سوچ نظروں سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔



رات کا وقت تھا۔ اندھیرے نے ملائشیا کو گلے لگا رکھا تھا۔ علیزے نے بہت دنوں کے بعد ماما کے ساتھ مل کر کوئنگ کی تھی۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ ماما سو گئی تھیں۔ جبکہ علیزے ہمیشہ کی طرح اس رات بھی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔

”ایسا کیا تھا اس ڈائری میں جو ماما نے مجھے وہ نہیں دیکھنے دی۔“ وہ پُر سوچ نگاہوں سے سیاہ آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ آج تک ماما نے اس سے کچھ نہ چھپایا تھا۔ پھر اس ڈائری میں ایسے کون سے راز تھے۔ جو وہ اس سے چھپانا چاہتی تھیں۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

اور پھر وہ اس بات پر بھی شکر بجالانے لگی کہ ماما کو اس کے جلد آنے کی وجہ معلوم نہ ہوئی تھی۔ اور اگر معلوم ہو جاتی تو.....! اس سے آگے وہ سوچ ہی نہ سکی۔

”میں اب ماما کو محمد امیر کی وجہ سے پریشان نہیں کروں گی“ اس نے گویا تہیہ کیا تھا اور خود

پریشان ہو گئے۔
دونوں نے کھانا کھایا تھا۔ اور پھر واپس جانے لگے۔

سڑک کے ساتھ ساتھ دور، دور تک شفاف شیشوں والی لچکدار اور دلکش دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ازائیل احتیاط سے چیئر کو دھکیل کر جا رہی تھی کہ ایک دکان کے سامنے جا کر اوپس رک گیا۔ اس نے وہیل چیئر آگے بڑھانے سے منع کر دیا۔

”کیا ہوا؟“

ازائیل نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

عائشہ گل چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لے آئی تھی محمد امیر لباس تبدیل کر کے آگیا تھا۔ وہ مسلسل چھینک رہا تھا۔ اسے فلو ہو چکا تھا۔ اور عائشہ گل دونوں ہی پریشان ہو رہی تھیں۔

مولیٰ سافلہ خالہ جان، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بوتا ہوا عائشہ گل کے متفکر چہرے کو دیکھنے لگا۔

”منع بھی کیا تھا بارش میں مت نہاؤ اور پھر بارش بھی سخت سردی کی۔ امی گویا ہو گئیں۔“

”سچ میں خالہ جان بہت مزہ آیا“ وہ ہنس دیا۔ اسی لمحے اس کے موبائل فون پر کال آئی۔ اس نے کال ریسیو کر کے موبائل فون کان کو لگایا تو اس کے مسکراتے لب فوراً کٹ گئے۔ اور چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔

امی اور عائشہ گل نے اسے بغور دیکھا۔ نا جانے کیا بات تھی جو اس کے چہرے کا رنگ اچانک بدلاتھا.....!

جاری ہے

”بے فکر ہو جاؤ بیٹا! یہ ہمارا درد سر نہیں۔ حسین بھائی خود اسے راہ راست پر لے آئیں گے۔“ حسن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسی طور نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماما پاپا جائیں گے اور تمام معاملہ سلجھا کر آئیں گے۔ مگر ابھی تک مسئلہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

ایک نہایت خوبصورت سی شام نور پور کے شہر میں اُتری تھی۔ اور اس کی خوبصورت ظاہر شرارت سے بہت پھر رہی تھی۔

کرسمس میں کچھ دن باقی تھے۔ ازائیل، اوپس کو ساتھ لئے شاپنگ کے لئے نکلی تھی۔ اس کی چیئر کو دھکیلتے ہوئے وہ مختلف دکانوں جاتی، شرٹس لا کر اس کے ساتھ لگا کر دیکھتی، آئینے کے سامنے لے جاتی اور پھر اس کی مرضی اور پسند در یافت کرتی۔

”جو تمہیں اچھا لگے لے لو۔“ اوپس بس یہی کہتا اور بالآخر ازائیل نے اپنی مرضی اور چوائس سے اس کے لئے سُرخ شرٹ اور سیاہ جینز لے لی۔ جو اس کے سُرخ و سفید رنگ پر خوب چلتی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی شاپنگ کی۔ اب کی بار بھی وہ اس سے اس کی رائے لیتی رہی تھی۔ اور اب کی بار وہ اسے بھرپور مشورے دے رہا تھا۔ جو مسکراتے ہوئے ازائیل نے قبول کئے تھے۔

اس نے اوپس کے مشورے پر اپنے لئے سُرخ اور سیاہ کے امتزاج کی اسکرٹ لی تھی۔ شاپنگ کئے بعد وہ اسے سڑک کنارے بنے ایک ریسٹورنٹ میں لے آئی تھی۔ وہاں ان